مسئلہ فلسطین

اور ملت اسلامیہ عالم

از: ڈاکٹر اختر مہدی

گذشتہ نصف صدی سے بھی کچھ زیادہ عرصے سے پوری دنیائے بشریت میں ہلچل مچی ہوئی ہے کہ مسئلہ فلسطین کا حل لازمی ہے لیکن عالمی ابلاغ عامہ نے بڑی طاقتوں کے دباؤ میں حقائق کو کچھ اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے کہ اکثر لوگوں کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ آخر اصل مسئلہ کیا ہے اور جب مسئلہ مبہم ہو جائے تو واضح اور منصفانہ و عادلانہ حل کی امید ہی نہیں کی جاسکتی۔

در حقیقت سرزمین فلسطین صدیوں سے عربوں کا وطن ہے۔ ان عرب باشندوں میں مسلمان یہودی اور عیسائی مذاہب کی پیروی کرنے والے ۱۹۴۷ء تک آپسی میل جول کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ تاریخی اعتبار سے سلطان صلاح الدین ایوبی نے فلسطین کو ۱۱۹۲ء میں حملہ آوروں کے چنگل سے نجات دلائی اور اس کے بعد ۱۹۱۷ء تک یہ ملک سلطنت عثمانیہ کا اٹوٹ حصہ بنا رہا۔ اس وقت برطانیہ دنیا کی اکلوتی بڑی طاقت تھا جس نے دنیا کے بہت بڑے علاقے کو اپنے نو آبادیاتی نظام کا حصہ بنا رکھا تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ سلطنت برطانیہ میں سورج ڈوبتا ہی نہیں ہے۔ بہر حال ۱۹۱۷ء میں برطانیہ سرزمین فلسطین میں ایک یہودی ملک کی تشکیل کا عہد کرتا ہے جس کا کوئی منطقی اور قانونی جواز نظر نہیں آتا کیونکہ اس زمانے میں اس سرزمین میں ۹۸ فیصد مسلمان اور صرف ۲ فیصد یہودی آباد تھے لیکن

طاقت کے نشہ میں ڈوبے ہوئے برطانوی وزیر خارجہ آرتھر بلفور نے برطانوی منصوبے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ''برطانیہ کا مصمم ارادہ ہے کہ سرزمین فلسطین میں یہودی ملک کی تشکیل کرے'' واضح رہے کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران حب اسلامی علاقوں پر اتحادی جماعت کا اثر ورسوخ بڑھا تو برطانوی فوج نے فلسطین پر قبضہ کرلیا کیونکہ اس وقت ترکی درحقیقت جرمنی کے ساتھ تھا۔ عالمی جنگ کے دوران ترکی کے خلاف برسرپیکار حکومتوں نے اس برطانوی منصوبے کا بھرپور استقبال کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے برطانوی اقتدار کی حمایت وسرپرستی میں ۱۹۲۰ء سے فلسطین میں دنیا کے مختلف ملکوں سے یہودیوں کی آمد کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور دنیا کا ہر ملک خوشی خوشی یہودیوں کو فلسطین کی طرف ڈھکیلنے لگتا ہے کیونکہ برطانوی حکومت کی خوشنودی کے ساتھ ہی ساتھ اس ملک کو یہودیوں کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور استحصالی کرتوتوں سے نجات بھی مل جاتی تھی۔ فلسطین میں یہودیوں کی نوآبادکاری کا بنیادی مقصد اس ملک میں یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان خوفناک خانہ جنگی کی شروعات تھی تاکہ برطانیہ کو اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا بہانہ ہاتھ آجائے کیونکہ یہ برطانوی سامراج کا آزمودہ نسخہ رہا ہے کہ پھوٹ ڈالو اور راج کرو اور سرزمین ہندوستان میں وہ اپنے اس اسلحے سے عظیم الشان کامیابی حاصل کرچکا تھا۔

بہرحال منصوبہ بلفور کے اعلان کے بعد برطانوی اقتدار کے سایہ میں دنیا کے کونے کونے سے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا جانے لگا اور وہاں کے اصل اور حقیقی باشندوں کو مرعوب کرنے کے لئے سمیناروں اور کانفرنسوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ان کانفرنسوں کے ذریعہ فلسطینی مسلمانوں کو یہ پیغام دیا جاتا تھا کہ فلسطین یہودیوں کا ملک ہے۔ مسلمانوں کو از خود یہاں سے چلا جانا چاہئے ورنہ انہیں قتل وخونریزی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس قسم کی پہلی کانفرنس ۱۹۱۹ء میں منعقد ہوئی تھی۔ دوسری طرف بیرونی یہودیوں کی آمد کی وجہ سے فلسطین میں یہودیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ صرف ۱۹۳۵ء میں بیرونی ممالک کے ۶۰۰۰۰ یہودیوں کو سرزمین فلسطین میں آباد کیا گیا تھا۔ دو سال کی مختصر مدت کے دوران سرزمین فلسطین میں یہودیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ برطانوی حکومت کی تشکیل شدہ بل کمیٹی اپنی رپورٹ میں یہ سفارش پیش کرتی ہے کہ فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ مسلمانوں اور دوسرا حصہ یہودیوں کے سپرد کر دیا جانا چاہئے اور ۱۹۳۹ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے یہودیوں کو یہ خصوصی مراعات حاصل ہو جاتی ہے کہ آئندہ پانچ برسوں کے دوران وہ لوگ ہر سال دس ہزار بیرونی ممالک کے یہودیوں کو سرزمین فلسطین میں آباد کر سکتے ہیں اور ۱۹۴۸ء میں برطانوی حکومت فلسطین سے اپنی فوجوں کی واپسی کے اعلان کے ساتھ ہی ساتھ سرزمین فلسطین میں ایک نئے ملک اسرائیل کی تشکیل کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ پوری دنیا میں اسرائیل وہ تنہا ملک ہے جو دنیا کے نقشے پر پہلے ظاہر ہوا اور بعد میں اس کا جغرافیائی ڈھانچہ تیار کیا گیا۔

اس مختصر مگر لازمی تاریخی پس منظر کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برطانیہ نے یہودیوں کے وطن کی حیثیت سے فلسطین ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ مسئلہ فلسطین کو ایک علاقائی اور قومی مسئلہ سمجھنے کے بجائے اسلامی مسئلہ کیوں قرار دیا جائے؟ مسئلہ فلسطین کے سلسلہ میں دنیا کے اہم اسلامی ممالک اور عالمی مسلمانوں کا رد عمل کیا رہا؟ فلسطین جدوجہد کی ناکامی کا راز کیا ہے؟ اور سردست فلسطین کی نجات کے لئے کیا کیا جانا چاہئے ار عالمی انسانی برادری بالخصوص ملت اسلامیہ عالم اس سلسلے میں کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

پہلے اور بنیادی سوال کے جواب میں اس مسلم الثبوت حقیقت کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے ہے کہ مذاہب کی تاریخ میں اسلام ایک نوجوان مذہب ہے کیونکہ یہودیت اور عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کا ظہور بعد میں ہوا ہے اور اس کی ظاہری عمر کل ۱۴۲۲ سال کی ہے لیکن اپنے آفاقی اور انسانیت دوست پیغامات کی وجہ سے آج دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں سے اشھد ان محمّد رسول اللّٰہ کی آواز بلند نہ ہوتی ہو اور اس پسندیدۂ خدا دین مبین کی پیروی کرنے والے موجود نہ ہوں بلکہ یہ کہنا زیادہ حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ ۲۴ گھنٹوں میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جب یہ الٰہی آواز عالمی فضا کے کسی گوشے میں نہ گونج رہی ہو۔ مذہب اسلام کی یہ غیر معمولی مقبولیت دنیا کے ایک گوشے میں محدود عیسائیت و یہودیت کو قطعی اچھی نہ لگی لہٰذا ان لوگوں نے ایک منصوبہ بند پروگرام کے تحت فلسطین میں یہودی ملک کی تشکیل کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کو یہ اندازہ تھا کہ مسلمانوں کا قبلۂ اول یعنی بیت المقدس اسی سرزمین میں واقع ہے اور قرآن شاہد ہے۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی۔" کہ ہمارے پیغمبر جس جگہ سے معراج کیلئے تشریف لے گئے تھے وہ اسی سرزمین میں واقع ہے۔ اس کے علاوہ ایسی دوسری عبادت گاہیں بھی موجود ہیں جن کی وجہ سے فلسطین دنیا کے ایک ارب مسلمانوں کا دھڑکتا ہوا دل بن گیا ہے اور اسلام کے قلب پر قبضہ جمانے کے بعد مسلمانوں کو راہ مستقیم سے منحرف کر دینے میں اسرائیل کو کوئی دشواری نہ ہوگی۔ اس کی اسی حکمت عملی کے بموجب ہم پورے وثوق و مکمل اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں فلسطین ایک علاقائی یا محض عرب قوم کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ خالص اسلامی مسئلہ ہے اور اس کا دنیا کے تمام مسلمانوں سے گہرا تعلق ہے اور برطانیہ نے یہودیوں کے وطن کی حیثیت سے اس

سرزمین کا انتخاب اسی لئے کیا تھا کہ ملت اسلامیہ کو ذلت و رسوائی کا شکار بنایا جاسکے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ۱۹۷۹ء میں مصر و اسرائیل کی کوشش اور امریکی حمایت و سرپرستی میں جب کیمپ ڈیوڈ معاہدہ پر دستخط کی بات آئی تو اس کام کیلئے اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ کا انتخاب کیا گیا تاکہ مسلمانوں کے گلے میں ذلت و رسوائی کا یہ طوق اسی شہر میں ڈالا جائے جو ایک وقت میں اسلام اور مسلمانوں کی عظمت کا منارہ رہا ہے۔ بہر حال یہ بات ثابت ہو گئی کہ مسئلہ فلسطین ایک اسلامی مسئلہ ہے جس کا دنیا بھر کے مسلمانوں سے گہرا تعلق ہے۔

اب یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ فلسطین پر اس غاصبانہ تسلط کے خلاف اسلامی ممالک کا ردعمل کیا رہا اور فلسطینی جدوجہد کو ایک طویل عرصے تک ناکامی کا منہ کیوں دیکھنا پڑا۔ واضح رہے کہ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی تشکیل کے بعد اسلامی ممالک کی حکومتوں کی طرف سے اکثر بیانات جاری ہوتے تھے جن میں اسرائیل کی مذمت اور فلسطینیوں کی حمایت کا ذکر ہوا کرتا تھا اور یہ سلسلہ ۱۹۶۳ء تک جاری رہا اور اسی دوران آزادی فلسطین تحریک کے نامور مجاہد حسن البناء کی شہادت بھی واقع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں عربوں اور اسرائیلیوں کے درمیان خوفناک جنگ ہوتی ہے جس میں ہزاروں فرزندان توحید شہادت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں اور فلسطینی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آوارہ وطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور اسلامی ممالک کے سربراہ صدقہ و زکوٰۃ کی رقم سے ان کی کفالت کو نجات دنیوی و اخروی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اور بعض اسلامی ملک جیسے ایران اور جارڈن وغیرہ تو اسرائیل کی حمایت کرنے میں بھی شرم نہیں محسوس کرتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران اسرائیلی جنگی جہاز ایران کے فوجی ہوائی اڈوں سے اڑان بھر کر عرب مسلمانوں پر بمباری کرتے تھے اور اسی دوران

اردن میں فلسطین پناہ گزینیوں کا وحشیانہ قتل عام دنیائے بشریت کو لرزہ براندازم کر دینے کے لئے کافی ہے غرضکہ فقط ۱۹۶۷ء میں ہی نہیں بلکہ ۷۳-۱۹۷۰ء کے دوران دوسری عرب اسرائیل جنگ میں بھی عربوں کو شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ شکست کے بعد شکست کا بنیادی راز یہ تھا کہ آزادی فلسطین تحریک کی بنیاد قومیت پر قائم تھی اور اسلامی ممالک کے حکمراں خدا ورسول اور اپنے عوام پر بھروسہ کرنے کے بجائے امریکہ پر بھروسہ کرتے تھے۔ اور ہمہ وقت امریکہ کی خشنودی حاصل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ اگر ابتدائی مرحلہ میں ہی اس تحریک آزادی فلسطین کو اسلامی بنیادوں پر مستحکم کیا گیا ہوتا تو یہ شرمناک ناکامی یقیناً کامیابی میں تبدیل ہو جاتی۔

واضح رہے کہ امام خمینیؒ نے اپنی اسلامی تحریک کے آغاز میں شاہی حکومت کی تین اسلام دشمن کرتوتوں کا ذکر کیا تھا جس میں ایرانی حکومت کی اسرائیل دوستی بھی شامل ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں اپنے تحریری بیان میں یہ اعلان فرمایا تھا کہ "اسرائیل اسلامی ملکوں کے خلاف جنگ و نبرد آزمائی میں سرگرم ہے... میں عالم اسلام کو اس اہم خطرے کی طرف برابر متوجہ کرتا چلا آرہا ہوں" شاہی حکومت اور اسرائیل کے درمیان دوستانہ تعلقات پر اپنا شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے وہ اعلان کرتے ہیں۔ "میں مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں اور اسلامی ملکوں سے یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ شیعہ مسلمان اسرائیل اور اسرائیلی ایجنٹوں کے مخالف ہیں اور اسرائیلی حکومت کو سرکاری طور پر تسلیم کرنے والے ملکوں کی بھرپور مذمت بھی کرتے ہیں۔" جلاوطنی کے زمانہ میں لکھی گئی اپنی کتاب "تحریر الوسیلہ" میں وہ اسلامی ملکوں کے نام یہ فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ وہ ایسے تمام ملکوں سے اپنے سفارتی اور تجارتی تعلقات منقطع کرلیں جو اسلامی مفاد کے خلاف اسلام دشمن حکومت

کے ساتھ کوئی معاہدہ کرتے ہیں۔"

امام خمینیؒ کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ شاہی حکومت اسرائیل کی حمایت کر رہی ہے۔ پھر بھی انہوں نے اس وقت کے وزیر اعظم کے نام ایک خط ارسال فرمایا جس میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ لکھا کہ "اسرائیل کے ساتھ ہرگز کوئی معاہدہ نہ کرنا کیونکہ اسرائیل دشمن اسلام ہے اور اسرائیلی حکومت نے دس لاکھ سے زیادہ فلسطینی مسلمانوں کو آوارہ وطن کر دیا ہے لہٰذا اسرائیل کے لئے مسلم بازاروں کا دروازہ ہرگز نہ کھولنا۔" ۱۹۶۵ء میں سرزمین نجف اشرف سے مسلمانوں کی فکر کو جھنجھوڑتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں کہ "آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ مٹھی بھر لٹیرے اور خانہ بدوش یہودی دس لاکھ سے زیادہ فلسطینی مسلمانوں کو ان کے وطن سے باہر نکال دیں۔ کیا اس کا بنیادی سبب یہ نہیں کہ ہم لوگ راہ حق سے منحرف ہو گئے ہیں اور وہ اپنے باطل موقف پر اٹل اور ثابت قدم ہیں۔" پس ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ ہو یا ۱۹۶۹ء میں مسجد الاقصیٰ کو نذر آتش کرنے کا واقعہ اور اسی طرح خواہ وہ اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ ہو یا ۱۹۷۷ء میں سادات کا سفر بیت المقدس یا پھر ۱۹۷۹ء میں ہونے والا شرمناک معاہدہ کیمپ ڈیوڈ ہر مرحلہ میں انہوں نے اسلام دشمن سازشوں کے خلاف اپنے حق پسندانہ موقف کا باقاعدہ اعلان کیا اور ساری دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں وہ دنیاوی طاقتوں کو خاطر ہیں نہیں لاتے۔ چنانچہ فروری ۱۹۷۹ء میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد جب وہ ایران تشریف لائے تو انہوں نے اسرائیلی سفارت خانے کی عمارت میں فلسطین مجاہدین کا دفتر قائم کروایا اور ملت اسلامیہ عالم سے یہ مطالبہ کیا کہ دنیائے بشریت بالخصوص ساری دنیا کے مسلمانوں کو فلسطینی مظلوموں کے دردناک حالات سے باخبر کرنے کے لئے رمضان المبارک کے

آخری جمعہ کو "عالمی یوم قدس" منانے کا اہتمام کیا جائے تاکہ اسرائیلی جلادوں کو یہ پتہ چل سکے کہ جن فلسطینی مسلمانوں کا قتل عام کیا جارہا ہے وہ عالمی اسلامی برادری کا اہم حصہ ہیں اور بیگناہوں کا یہ خون رائگاں نہیں جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا چنانچہ رمضان المبارک کے مہینے میں عالمی فضا "اسرائیل مردہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور فلسطین کی حقیقی آزادی تک جاری رہے گا۔ ۱۹۸۷ء میں جب اسرائیلی مظالم کے خلاف فلسطینی مجاہدوں نے "انتفاضہ کے سایہ میں اپنی مسلحانہ جوجدوجہد شروع کی تو امام خمینیؒ نے ان کی اعلانیہ اور پھرپور حمایت کی اور فقط ایرانی حکومت ہی نہیں بلکہ عوام سے بھی یہ اپیل کی کہ وہ فلسطینی مجاہدوں کی حوصلہ افزائی کریں۔ چنانچہ ایران کا بچہ بچہ اپنے قائد عظیم الشان کی سفارش پر عمل کرتے ہوئے آج بھی فلسطینی مجاہدوں کی بھرپور حمایت کررہا ہے۔ اور سرزمین لبنان میں انتفاضہ کی عظیم الشان کامیابی نے یہ ثابت کردیا ہے کہ خدا کی ذات پر اپنے اٹل اعتماد کی وجہ سے ہی سنگ بردار فلسطینی اور لبنانی مجاہدوں نے بمباری اور گولہ باری کرنے والی طاقتور اسرائیلی فوج کو جنوبی لبنان کی سرحدوں سے باہر نکال دیا اور آج فلسطین کی آزادی کیلئے ہمہ تن سرگرم عمل ہیں۔

۲۰ر اکتوبر ۲۰۰۰ء کو تہران میں تقریباً ایک لاکھ دس ہزار رضاکار ایرانی مجاہدوں نے عظیم ریلی کا اہتمام کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ وہ مسلح فلسطین مجاہدوں کی حمایت کے لئے ہمہ تن آمادہ ہیں اور ۲ر مئی ۲۰۰۱ء کو تہران میں منعقد فلسطینی انتفاضہ حمایت کانفرنس کے دوران ایران کے مذہبی رہنما آیت اللہ خامنہ ای نے یہ اعلان فرمایا کہ ایران فلسطینی مجاہدوں کے ساتھ ہے اور اسرائیلی مظالم اور امریکی اسلام دشمن سازشوں کی بھرپور مذمت کرتا ہے۔ اس عالمی کانفرنس میں موجود اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر حجت

الاسلام محمد خاتمی نے اپنی تقریر کے دوران آیت اللہ خامنہ ای کے بیان کی اعلانیہ حمایت فرمائی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام خمینیؒ نے جس اسلامی موقف کا اعلان کیا تھا ایرانی حکومت اور عوام آج بھی اسکے پیرو ہیں۔

در حقیقت سرزمین فلسطین میں اسرائیل نامی ملک کی تشکیل کے بعد جلاد صفت صہیونی حکومت کی ظالمانہ راہ و روش کے خلاف انقلابی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس مجاہدانہ نقل و حرکت کی بنیاد قومیت تھی اور دنیاوالوں کو یہ بتایا جارہا تھا کہ عربوں اور یہودیوں کے درمیان بہت پرانی دشمنی چلی آرہی ہے اور اسی وجہ سے یہ لوگ آئے دن برسرپیکار رہا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی پروپگنڈہ کے سایہ میں فسلطینی مظلوم گذشتہ چار پانچ دہاہیوں سے دربدری کی زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں۔ واضح رہے کہ عرب قومیت کے نام پر لڑی جانے والی ہر جنگ میں فلسطینی مظلوموں کو باربار منہ کی کھانی پڑی کیونکہ اکثر حکومتیں امریکی دباؤ کے سایہ میں خاموش تماشائی بنی رہ گئیں اور اسلام دشمن طاقتیں اپنا اثرورسوخ قائم کرنے اور بڑھانے میں کامیاب رہیں۔

واضح رہے کہ گذشتہ پانچ دہائیوں کے دوران فلسطینی مظلوموں کو عالم اسلام سے کوئی حمایت وسرپرستی حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس جارڈن میں امریکی اشارہ پر ہزاروں آوارہ وطن فلسطینی عوام کو تلوار کے حوالے کردیا گیا، دیگر اسلامی ملکوں سے فلسطینی مجاہدوں کو صدقہ وزکوۃ کے علاوہ اور کچھ نہ حاصل ہوسکا۔ اور شرمناک بات تو یہ ہے کہ اسرائیل کی مکر آمیز تجویز صلح کو عملی رنگ وروپ عطا کرنے میں شاہ فہد نے نمایاں خدمت انجام دی ہے اور پوری دنیا پر ثابت کرنے کی کوشش ہے کہ اسرائیل ایک ناقابل شکست طاقت کا حامل ہے اور یہ بات قطعی مناسب نہیں ہے کہ اسرائیل کے خلاف

اس جدوجہد کو جاری رکھا جائے۔ پس اجمالی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلسطینی مظلوموں کو اپنی اس طولانی جدوجہد کے دوران عرب حکومتوں سے زبانی حمایت وسرپرستی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوسکا۔

معاہدہ کیمپ ڈیوڈ کے بعد فلسطینی مجاہدوں کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوگیا کہ قومیت کے نام پر انہیں کامیابی حاصل ہونے والی نہیں ہے لہٰذا فلسطینی نوجوانوں نے پرچم توحیدی کے سایہ میں انتفاضہ نامی تنظیم کی تشکیل کے بعد صہیونی جلادوں کے خلاف اپنی مسلحانہ جدوجہد چھیڑ دی اور یہ طے کیا کہ جملہ آور دشمنوں کے خلاف نبرد آزمائی کرتے ہوئے موت کو گلے لگانا زیادہ بہتر ہے۔ اپنی اس شجاعانہ روش کے ذریعہ ان نوجوانوں نے اسرائیل کے اس غرور کو چکنا چور کردیا کہ اس کا مقابلہ ناممکن ہے۔

آج اسرائیل ان فلسطینی بے گناہوں پر گولہ باری کررہا ہے جنہیں کیمپ ڈیوڈ معاہدہ صلح کے بموجب آزاد فلسطین میں باقاعدہ آباد کیا گیا تھا۔ اگر یہ قتل عام دنیا کے کسی دور افتادہ علاقے میں بھی رونما ہوا ہوتا تو انسانی حقوق کے نام نہاد ٹھیکداروں نے فلک شگاف نعرے بلند کردئے ہوتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امریکی حمایت کے سایہ میں کام کرنے والے ان عالمی اداروں کی نظر میں فلسطینی مظلوم انسان کہلائے جانے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ جی نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے یہ فلسطینی مجاہدین فقط انسان ہی نہیں بلکہ جائز حقوق کی بحالی کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے والے عظیم انسان ہیں جن کا اٹل ارادہ یہ ہے کہ سرزمین فلسطین کو اسرائیلی جلادوں کے چنگل سے آزاد کرانا ہے اور انشاء اللہ دنیا کی انصاف پسند تنظیموں کی حمایت وسرپرستی میں یہ لوگ اپنے مشن میں یقیناً کامیاب ہوں گے۔

☆☆☆